



# بادشاہ تماشا اور فنکار

(افسانے)

اشفاق رشید



## ابھی جاں باقی ہے

فرید!

دکھاں سیتی دھوں گیا

سولاں سیتی رات

کھڑا پکارے پاتنی

بیڑا کپڑا وات

(بابا فرید شکر گنج)

اس کی گردن میں سبزی مائل گھنگروؤں والا پٹا ہے جس پر پیتل کی ایک خوبصورت تختی لٹک رہی ہے۔ تختی پر لکھی عبارت گردن میں پڑے اس پھندے سے زیادہ اذیت ناک ہے جو ایک ہی جھٹکے میں کام تمام کر دیتا ہے اور زندگی کا گھنگرو ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن یہاں جھٹکا نہیں عبارت ہے۔ وہ عبارت کے استبداد پیہم کا شکار اس کے روز افزوں تنگ ہوتے ہوئے حصار کو توڑنا چاہتا ہے عبارت کا مفہوم بدل کر زندگی کی ناؤ کو سماج کے چڑھتے دریا کے تھیروں سے محفوظ رکھ کر محسوس فرہنا چاہتا ہے لیکن اس کا حال اسے بے یقینی اور مستقبل لایسعیت کے سوا کچھ بھی دینے کو تیار نہیں۔ بے بس وہ خواب دیکھتا ہے اس پٹے سے اور اس چمکتی زنجیر سے نجات کے جو کبھی کسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کبھی کسی کے۔

سارا سارا دن وہ اس کوشش میں سرگرداں رہتا کہ کسی طرح اس کا منہ پٹے تک پہنچ جائے اور وہ دانتوں سے اسے چبا ڈالے۔ کشمکش کے اس لمحے میں گھنگروؤں کی چھن چھن کا شور اس کے اندر کا شور بن جاتا ہے۔ کبھی تو وہ اس قدر غصے میں ہوتا کہ زنجیر والے ہاتھ کو دیکھ کر دانت پیسنے لگتا اور گھنگھرو اور زیادہ شدت سے بجنے لگتے۔ کبھی بیٹھا وہ دیر تک کھونٹی کو

گھورتا رہتا۔ نظروں سے اسے توڑتا رہتا اور جب کوئی بات نہ بنتی تو کھڑا ہو کر اسے زور زور سے لکارنے لگتا اور پھر اسی کشمکش میں پاؤں پیچھے کرتے، آگے کرتے، زور لگاتے زنجیر اس قدر تن جاتی کہ گھنگھروؤں کی آواز دب جاتی اور اس کی آنکھیں ابل پڑتیں۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی تو آخری بار بھرپور زور لگا کر زور لگانا ترک کر کے جھرجھری لیتا۔ گھنگھرو پھر چمن چمن بجنے لگتے۔

اس کی زنجیر سے بیگانگی یوں مافیاً بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جیسے کوئی قوت ہے جو اسے زنجیر سے چھٹکارے کے لئے اکسا رہی ہو اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔ اس کی خواہش نے اسے مسلسل بے سکونی و بے چینی کے آسیب میں گرفتار کر رکھا ہے۔ لیکن اس خواہش کا کوئی محرک بھی تو ہوگا۔ پہلی بار جب اس نے آنکھ کھولی تو خود کو اس چار دیواری میں مقید پایا اور کہا گیا یہ اس کا گھر ہے۔ اس روز گھر میں بڑا جشن منایا گیا۔ یہی جگہ ہے جہاں اس نے جسمانی و ذہنی ارتقاء کی منازل طے کیں۔ کبھی محبت اور کبھی نفرت۔ کبھی کامیاب ہو تو کبھی ناکام۔ لیکن شکست ہمیشہ کامیابی پر غالب رہی۔ اور پھر اس گھر میں وہ دن بھی آیا جب اس کے غصیلے پن کو دیکھ کر پہلی بار اس کی گردن میں پٹہ ڈالا گیا۔ لگتا تھا جیسے گھر بھر میں کوئی طوفان آیا ہو۔ وہ کسی طور اس طوق کو گلے کا ہار بنانے کو تیار نہ تھا، کھونٹی سے بندھنے کو راضی نہ تھا لیکن وہ ہار گیا۔ پھر اس نے سوچا شاید ہار تو میں تب ہی گیا تھا جب میں نے اس گھر میں آنکھ کھولی تھی۔

سارا منظر جیسے اس کی نظر میں گردش کرنے لگا۔ مایوسی اور بے بسی اب اس کا مقدر ہوئی۔ زنجیر سے چھٹکارے کا ایک محرک تو یہ بھی تھا کہ وہ دیکھتا آیا تھا کہ اس کا باپ بھی اس زنجیر اور پٹے سے نہ صرف نفرت کرتا تھا بلکہ وہ تو ہر لمحے غصے میں بھرے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالا کرتا اور زنجیر کو توڑنے کی سعی کرتا۔ ہر بار ناکامی کے آنسو اسے طاقت اور دے دیتے۔۔۔۔۔ دن ہو یا رات وہ آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ سورج، چاند اور ٹمٹماتے ستاروں سے باتیں کرتا انہیں اپنی مظلومیت کا نوحہ سناتا۔ لیکن پھر اس کی خاموشی جیسے ان کے لئے طعنہ بن جاتی۔ وہ پھر ان سے پرے گھرے آسمان میں جھانکتا اور بلند آواز میں بولنے لگتا۔ ”زنجیر تو تنتی ہی جاتی اور تو ہے کہ ادھر دھیان ہی نہیں دیتا۔ ادھر دھیان ہی نہیں دیتا۔“ آواز اس کا نوحہ خلا کی پرتوں میں گونجتا کہیں گم ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی۔ چاند سیاہ بادلوں



کے پیچھے چھپ جاتا۔ فضا میں سکوت طاری ہو جاتا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک روز اس کا باپ اس طوق سے آزاد ہونے میں کامیاب تو ہو گیا پر اسی روز اس نے ایک پٹانے کی آواز بھی سنی، جس کے بعد پھر اس نے کبھی اپنے باپ کا چہرہ نہ دیکھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کی ماں نے بھی اس طوق کو شکست دینے کے لئے زندگی کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ تو زنجیر سے چھٹکارے کی خواہش اس میں فطری ہے یہ اسے اس کے ماں باپ کی طرف سے ورثے میں ملی ہے۔ اب یہ خواہش، یہ خواب، حقیقت بننے کے لئے ہر وقت اسے بے چین کئے رکھتا ہے اور تنہا ہی وہ جنگ کرنے پر مجبور ہے۔

دھوپ میں بیٹھے آسمان میں چکر کا تکی گدھوں کو دیکھتے ہی وہ کانپ سا جاتا ہے۔ پھر وہ جھرجھری لے کر چڑیوں کو دیکھتا ہے جو روٹی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے لئے آپس میں جھگڑ رہی ہیں۔ یہ جھگڑے یہ شور، لیکن پھر یہ شور بھی ختم ہو جاتا ہے، چڑیاں اڑ جاتی ہیں۔ وہ انہیں دیکھتا ہے، خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ بے زاری سے وہ آنکھیں بند کر کے سورج کی کرنیں اپنے جسم پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن کھیاں ہیں کہ اسے مسلسل تنگ کر رہی ہیں۔ آخر تنگ آ کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ادھر ادھر چکر کاٹنے لگتا ہے۔ زنجیر کی ڈھیل ختم ہو جاتی ہے۔ گھنگھروؤں کا شور ختم جاتا ہے۔ اسی اثناء وہ آسمان میں دیکھتا ہے جہاں کونجوں کی ایک ڈار زنجیروں کی حدود سے پرے مغرب کی اوڑمخو سفر ہے۔ وہ جب بھی کونجوں کو دیکھتا، بے قابو ہو جاتا ہے۔ بے زاری کا لباس اتار کر وہ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے آزاد پرندوں کے ساتھ جیسے خود بھی اڑنے لگتا ہے۔۔۔۔۔ پھر کیا زنجیر تنے لگتی ہے اور پٹے کا حصار تنگ تر ہونے لگتا ہے۔ پٹے کا حصار اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگتی ہے۔ پورا گھر شور سے گونجنے لگتا۔ درختوں میں پرندے اس کی اس حالت کو دیکھ کر پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔ آخر کونجیں نظر سے اوجھل ہوئیں۔ کشمکش نقطہ عروج پر پہنچ کر ختم گئی لیکن وہ ابھی تک ساکت کھڑا مردوں سے بھری آنکھوں سے خالی آسمان کو دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔ اس کے بے ربط سانس کے ساتھ زبان بے زبان ہوئی لٹک رہی ہے۔

ادھر مالک نے جب سے اسے کونجوں کو دیکھ کر بے چین ہوتے دیکھا ہے۔ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ بھوک نے اسے مکمل طور پر خونخوار بنا دیا ہے لہذا اب یہ وہی کچھ کرے گا جو وہ چاہے گا۔ جس طرف اشارہ کرے گا اس چیز کو چیر پھاڑ

کر رکھ دے گا۔ ادھر وہ سمجھ رہا ہے کہ مالک اس سے خوفزدہ ہے اسی وجہ سے وہ ہر وقت ہاتھ میں برچھی والی چھڑی لئے ہوتا ہے اور پیچھے باڈی گارڈ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ دونوں طرف مختلف ہے مالک اس کی وجہ سے ہرگز پریشان نہیں ہے۔ اور پھر ایک قیدی اس کے لئے کیسے پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ خوفزدہ ہے تو اپنے ہی جیسوں سے جو اس گھر پر اسی طرح قابض ہونا چاہتے ہیں جیسے ہوا تھا۔ اسے خبر بھی نہیں کہ مالک نے تو اپنی حفاظت کی خاطر اسے اس قدر بھوکا رکھا ہے۔

یہ بھی اس گھر کی روایت ہے کہ کسی دوسرے جاندار سے تعلق نہ رکھا جائے۔ لیکن روایت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے تحت اب آپس کے تعلقات میں منافقت ضروری عنصر بن کر رہ گیا ہے۔ اس گھر میں اپنے جس بھائی بند پر اسے سب سے زیادہ اعتماد ہے اسی پر مالک کو بھی اعتماد ہے۔ مالک بھی ہر وقت اس کے تلوے چاٹنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ادھر بھائی بند کا قول ہے کہ ”کھری بات کہنا میرا نام، عدل میرا کام، مکاری سے بھاگوں ہوں“ لیکن ایک روز بھائی بند درندوں کو بے نقاب کرتا خود بے نقاب ہو گیا۔ اعتماد ایک بار پھر شرمندہ ہوا اور منافقت کی جیت ہو گئی۔ بھائی بند نے بھی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے عوض اپنا قول بیچ دیا۔ وہ اب پھر تنہا ہے۔ بھائی بند اب ہر نئی صبح مالک کا ایک نیا خنجر ایک نیا حکم اس کے سینے میں اتار جاتا ہے۔

بھوک و پیاس سے باولا ہوا وہ کھوٹی کے گرد چکر کاٹتے دیکھ رہا ہے کہ ادھر دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جا رہے تھے۔ کسی نے اس کی حالت دیکھ کر ایک چاندی گول روٹی اس کی طرف پھینکی ہے کہ کسی نے شاید علم غاء سے اس روٹی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ پہلا پہر ہے جو اسے روٹی ملی اور وہ بھی نجانے کون لے گیا۔ اسی حالت میں چکر کاٹتے، اس نے بتانا چاہا کہ وہ بھوکا ہے پیاسا ہے لیکن ہر بار ہی حلق میں آواز اٹک کر رہ گئی۔ اس مرتبہ اس نے بھرپور کوشش کی تو گلے کی رکاوٹ ایسی ہی کہ آواز کی گونج سے مالک کے آرام میں خلل پیدا ہوا۔ ادھر گیٹ پر کھڑے پہرے دار کو انٹر کام پر کوئی ہدایت ملی ہے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت رافٹیں اور ڈنڈے لئے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ سب نے مل کر اس پر ڈنڈوں، سنگینوں اور بٹوں کی ایسی بارش کی کہ وہ زخموں سے چور ہوا مدد دہم دہم پکارنے لگتا ہے۔ لیکن اس کی



مظلومیت کی آواز اس چار دیواری سے باہر نہیں جانے دی جاتی۔

وہ غصے سے بھرا گیراج کے کونے میں چپکا بیٹھا ہے۔ ایک بار پھر گھر کا منظر بدل گیا ہے۔ نیا مالک نئے لوگ گھر کا انتظام سنبھال چکے ہیں۔ وہ خاموش بیٹھا اپنے اندر کے الاؤ کو پھٹنے سے روک رہا ہے۔ شکست کے احساس کو سہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس کھوئی کو دیکھ رہا ہے۔ زنجیر کو دیکھ رہا ہے اور کبھی آسمان کو دیکھ رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ کتنی دفعہ اس گھر کا منظر بدلہ ہے اگر کچھ نہیں بدلاتو وہ اس کا اور اس گھر کا مقدر نہیں بدلا۔ نئے لوگوں نے پرانوں کی طرح اپنا جشن منانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا مزید چھوٹا کر دیا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انہوں نے بھی پرانوں کی طرح نقاب چڑھائے ہیں اور اس ایک لاش پر جھک گئے ہیں جسے وقت نے یا جسے ان لوگوں نے یا جسے فطرت نے خود ہی ان لوگوں کے سپرد کر دیا ہو۔ ان کے تیز دھار خنجر دم توڑتی لاش پر تیزی سے چل رہے ہیں۔ وہ بوٹی بوٹی اسے کاٹ رہے ہیں کھا رہے ہیں اور چڑیوں کو طرح آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ناچ رہے ہیں اس سے پہلے ایک دفعہ ادھر ٹنڈ ٹنڈ درخت پر بیٹھی گدھوں سے حیرانگی سے یہ منظر دیکھا، خوفزدہ ہوئیں۔ انہوں نے آپس میں کچھ فیصلہ کیا اور اس درخت سے اڑ گئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ٹنڈ ٹنڈ درخت اب خالی ہے۔ وہ کھاتے جاتے ہیں۔ پیتے جاتے ہیں اور جسموں کو بے ہنگم انداز میں ایک دوسرے پر گراتے، گرتے، اٹھتے، اٹھاتے ڈولتے، بکتے جھکتے جارہے ہیں اور بوٹی بوٹی سیرات کی چمگاڈ کی چیخ بن جاتی ہے مگر فضا میں گونج پیدا کئے بغیر اندھیرے سے کچھ بھی طلب کئے بغیر دم توڑ جاتی ہے۔ مگر اس پر ہول سکوت میں وہ اس جے ہوئے خون کے تودے کو دیکھ رہا ہے۔ اس پر جھکے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے بسی کے احساس سے تیزی سے چکر کاٹنے لگتا ہے۔ اس کے ہر چکر پر بے بسی اپنے انتقام کا دائرہ مکمل کرتی ہے مگر مکمل ہو نہیں پاتا۔ صرف دم کے گرد چکر لگانے سے کیا کوئی دائرہ مکمل ہو سکتا ہے پھر بھی وہ چکر کاٹ رہا ہے۔

نقاب والے اس کے اس اضطراب کو منہ میں آتے ہوئے ماس کے ذائقے جبروں کی مضبوطی کے لئے ماس کی طلب اور لذت کے پانیوں سے تعبیر کرتے ہوئے ماس کا ایک ٹکڑا اس کی طرف اچھال دیتے ہیں۔

ہر شے سیاہ پڑنے لگتی ہے۔ پھر جے ہوئے خون کے تودے کی مانند آسمان سے کالک چاروں اطراف ہر شے پر

دھیرے دھیرے اپنا آئینی سایہ ڈالنے لگتی ہے۔ پورا شہر اپنی تمام تر آوازوں سمیت اس بڑھتی ہوئی کالک کی تہوں میں بیٹھا جاتا ہے۔ پھر دور سے آنے والی اکے کے آگے جتے ہوئے گھوڑے کی سموں کی ٹپ ٹپ ٹپ چپ چپ چپ میں بدل گئی۔ کوئی چاپ نہیں ہے۔

کہیں سے الو نے ہونک بھری پھر سکوت۔ اس کی آنکھیں کھلیں، پھٹی پھٹی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ جیسے اس نے کچھ سننے کی کوشش بھی کی۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ سن رہا ہے۔ وہ سب جو اس نے زندگی میں سنا چاہا۔ جو اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ سکوت، موت اور جشن پھر ٹکڑے ہوئے پڑی لاش کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں وہ خود کو دیکھتا ہے لاش کی آنکھوں کی بے بسی اس کے اپنے خدو خال پہ اس کے سامنے پھیلی ہوئی باز، ٹنڈ منڈ درخت پر ہر شے پہ اپنا نقش چھوڑ چکی ہے۔ پھر ایک ایک اے محسوس ہوا، جیسے کالک کالک نہ رہی، ہر شے کسی کسی صاف شفاف آئینے کی مانند ہوئی۔ بے بسی کہیں نہیں، اگر کچھ ہے تو تمسخر ہے، لاش کی آنکھوں میں ہر نظر آنے والی شے، ٹھٹھا کر رہی ہے۔ ہر شے اپنے آپ پر اپنے اندر چھپے ہوئے خوف پر ٹھٹھا کر رہی ہے۔ خوف نے اس کے پاؤں کو زمین سے جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کی آواز گلے کی بجائے اس کے گھٹنوں میں آگئی ہے۔ بے بسی۔ اس نے لاش کی آنکھوں میں ایک بار پھر بے بسی کی شدید لہر دیکھی۔ اپنے باپ کو یاد کیا۔ جو پٹاخے کی آواز کے ساتھ ہی کہیں چلا گیا۔ نہ بعد میں کسی نے اسے دیکھا نہ سنا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا، اور پھر ایسے منہ موڑ لیا جیسے اب اور کچھ دیکھنے کی ضرورت نہ رہی ہو۔

طویل جنگ کے بعد سورج رات کے محاذ کو مات دینے میں کامیاب ہو گیا، نور کے تیروں سے کالک کا سینہ چھلنی کر کے اس نے گلابی اور سنہری زندگی کا پیغام دیا۔ درختوں نے پرندوں نے، چرندوں نے، آبشاروں نے۔۔۔۔۔۔ اور نسیم آوارہ کے جھونکوں نے اس پیغام کے سنتے ہی اپنے اپنے بگل بجائے۔ نئی زندگی کی خوشی میں سری اور بے سری آوازوں کا ایک شور اس زمین پر گونجنے لگا۔ ہر شے، اپنے اپنے حقیقی روپ میں موجود سچائی کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کر رہی ہے۔ لیکن اس گھر میں سورج کی کرنوں کے تیر کار گر ثابت نہیں ہوئے۔ ویسا ہی اندھیرا، گھپ اندھیرا آج بھی اس گھر پر طاری ہے۔ جیسا شاید کل کتنی صدیاں پہلے یہاں کا نصیب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نور کے تیر اس گھر پر بھی برسائے



گئے تھے۔ تاکہ یہاں کا اندھیرا بھی چھٹ جاتا لیکن انہیں راستے ہی میں روک لیا گیا اور تیر جنہوں نے بعد میں اس گھر کو نشانہ بنایا، گھر کا اندھیرا ختم کرنے کی بجائے انہوں نے اس امید کو پراسرایت کی کوٹھڑی میں بند کر کے تالے کی چابی اپنے پاس رکھ لی۔ اب نہ چابی کا پتہ چلے گا کہ کس کے پاس ہے کیونکہ کسی کو اب خود بھی پتہ نہیں کہ اس مقفل کوٹھڑی کو کیسے کھولنا ہے انہیں تو اب یہ بھی یاد نہیں کہ اس کوٹھڑی میں انہوں نے کس شے کو قید کیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس گھر میں ہر کسی کو ہر شے دکھائی دے رہی ہے۔ سب دیکھ رہے ہیں لیکن چیزوں کے نام ہاں چیزوں کے نام ان کے ذہنوں میں گڈمڈ ہو گئے ہیں یا شاید چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں سوائے سرخ گلاب کے۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں موندے جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے البتہ زنجیر آنکھیں کھولے، پتہ آنکھیں کھولے، مسلسل اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ روٹی کا اتنا بڑا ٹکڑا کہ جس پر صرف چڑیاں آپس میں لڑ سکتی ہوں۔ اس کے سامنے خاموش پڑا ہے۔ وہ اسی بے فکر اور بے نیازی سے بیٹھا ہے جیسے چلے کی حالت میں ہو۔ جیسے جب وہ آنکھیں کھولے گا تو اس کی آنکھوں کی چمک سے اس کال کوٹھڑی کا تالہ ٹوٹ کر گر پڑے گا، امید نہ صرف نظر آ جائے گی بلکہ بر آئے گی۔ جیسے جب وہ آنکھیں کھولے گا تو اس گھر کی دنیا بدلی ہوگی اس کے گلے میں طوق ہوگا، کھوٹی پر زنجیر اور نہ ہی مالک یا مالک کی کوئی اور صورت وہ آواز ہوگا۔

لیکن آنکھیں تو ہر روز اس کی کھلتی ہیں۔ پر ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوتا۔ کیا جو آنکھیں روز کھلتی ہیں ان کی چمک ہی اس کے دل کی مراد کو پورا کر سکتی۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولیں روٹی کا ٹکڑا ویسے ہی پڑا ہے۔ زنجیر اور گلے کا طوق ویسے ہی موجود ہیں۔ بے بسی، غصہ، غصے کا غصہ اٹھتا ہے اور کھوٹی کے گرد تیز چکر کاٹنے لگتا ہے اور تیز، بہت تیز چکر، کہ اس کی نظر گلہری پر پڑتی ہے۔ جو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر بیٹھی، ہولے ہولے اپنی دم ہلاتی اس خاموش روٹی کے ٹکڑے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے بڑے انہماک سے کھا رہی ہے۔

اس کے غصے کی شدت اس وجہ سے اور زیادہ نہیں ہو جاتی کہ وہ اس کے حصے کی روٹی کے ٹکڑے پر قبضہ جمائے ہے بلکہ غصے میں اضافہ اس بات پر ہے کہ وہ اس چار دیواری کے اندر کیوں آئی جس سے باہر جانا زندگی سے باہر جانے کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس اثنا گلہری اس کے منہ سے نکلنے والی آوازوں سے خوفزدہ ہو جاتی ہے اور بھاگ کر ایک

درخت پر چڑھنے لگتی ہے لیکن اس کی نگاہیں مسلسل اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ وہ ڈالی ڈالی ہوتی اوپر ہی اوپر چڑھے جا رہی ہے اور وہ حسرت سے اسے تنکے جاتا ہے کہ گلہری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور درخت سے اوپر اس کی نظر آسمان میں تیرتی کونجوں کی ایک ڈار پر پڑتی ہے۔ ایک برقی سی اس کے بدن میں دوڑ جاتی ہے۔ جیسے جیسے کونجوں کی ڈار اپنی منزل کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی نظریں اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ اس کے قدم خود ہی آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ اور گھنگھر وچھن چھن کرتے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ پھر زنجیر کی ڈھیل ناقابل برداشت حد تک تن گئی۔ پٹے کا حصار تنگ تر ہو گیا۔ گردن ایک ہی جگہ اکڑ گئی۔ گھنگھروؤں کی چھن چھن چھن رک گئی۔ رک کر حیرت سے متوقع تبدیلی کا انتظار کرنے لگی۔ آنکھیں ابل ابل پڑیں اور وہ زور لگاتا رہا۔ مالک نے دیکھا، اس کی طاقتور ٹانگ پر اپنی برچھی والی چھڑی سے بھرپور وار کیا، زخم ہوا کیا ہوا، اس کی ٹانگ میں لچک پیدا نہ ہوئی۔ پہرے دار نے دیکھا، آسمان کی طرف بندوق کا رخ کیا اور اکٹھے چھ پٹائے فضا میں گونج گئے لیکن وہ نہ ڈرا بلکہ پٹائے کی آواز نے تو اسے اور وحشی کر دیا، وہ اور زیادہ زور لگانے لگا۔ گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سب تھر تھر کانپنے لگے۔ اپنے گلوں پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ پھر ایک ہنگامی اجلاس بلا یا گیا۔ سب نے اپنے اپنے نقاب اتارے اور اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ فیصلہ ہوا کہ حق دار کو اس کا حق ملنا چاہیے، مستحق کو اس کا حق دیتے ہیں، اسی اجلاس میں کسی نے یہ کہا۔ ”کیا جو بولے صرف اسے ہی اس کا حق ملنا چاہیے یا سب کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔“ جواب ملا ”ہاں! ہم ان سب کو جو اپنا حق مانگیں گے انہیں ان کا حق دیں گے۔“ لیکن وہ ہے کہ اجلاس کے فیصلے سے متفق نہیں، وہ جونہی ڈٹا ہے کہ جانتا ہے یہ فیصلہ تو ہمیشہ سے موجود ہے۔ اجلاس کے اختتام پر سب نے اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے، کسی نے زبان سے کسی نے قلم سے اور کسی نے اس ”کچل دو“ پر عمل کیا۔ لیکن وہ خونم خون ہوا بڑھتا رہا۔ زخم بڑھتے رہے۔ وار اور زخم۔ زخم ہی زخم۔ لیکن لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وہ تنا کھڑا ہے۔ گھنگھر و خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ایک دفعہ پھر کونجوں کی ڈار نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے لیکن وہ منہ اٹھائے ابھی تک آسمان میں دیکھ رہا ہے۔ وہیں اس کی نگاہ لاش کی نگاہوں سے مل جاتی ہے۔ لاش پر جھکے رقص کرتے۔۔۔۔۔ لوگوں کی شبیہیں اس کی آنکھوں میں ابھرتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ زنجیر سے چھٹکارے کی خواہش















----- ”مارو مارو“ کے نعرے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ چکرایا، دھڑام سے گرا اور بیہوش ہو گیا۔

اتھلیٹ دوڑتے دوڑتے اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ وہ تھک چکے تھے، گر گر رہے تھے لیکن ٹارگٹ کا کہیں نشان نہ تھا۔ وہ ابھی تک سرخ بتی کے نیچے پڑا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے جسم میں اتر رہی تھیں۔ ایک چیونٹی نے اس کے کان کی لو سے گوشت اتارا اور اپنی راہ چل دی۔ آسمان گرگسوں کے دائروں میں چھپ گیا تھا۔

”دوڑو بھاگو جوان مر جائے گا“ بے چارہ مر جائے گا۔“ ایک ریڑھی والا اس کے پاس کھڑا چیخ رہا تھا۔ گاڑیوں کو روک رہا تھا۔ مگر گاڑیوں کے شیشے اڑ سے تھے۔ باہر آگ برس رہی تھی۔ بوڑھا بھاگتا جاتا، شور مچاتا جاتا۔

”ایک زندگی خطرے میں ہے، اسے بچاؤ۔“ ----- دوڑتے دوڑتے اسے ایک سرکاری ٹکا نظر آیا۔ ایک ایک قطرہ پانی آ رہا تھا۔ سڑک سے ایک گندا شاپرا اٹھایا اور اس میں پانی لاکر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے اور ٹوٹی سانسوں میں پانی اتارا۔ ----- اپنے پرانے سے اس پر چھاؤں کی اور دعاؤں کا ایک سرمایہ وہ اس کی زندگی پر نچھاور کرنے لگا۔ آسمان کی طرف سے رحمت کے منتظر بوڑھے کی جھریوں پر آنسو تیرتے ہی تھے کہ جوان نے آنکھیں کھولیں۔

”مم میں کہاں ہوا اور وہ اتھلیٹ، وہ اتھلیٹ“

”کون اتھلیٹ، پتر تو یہاں بیہوش پڑا تھا۔“

”نہیں تو میں بالکل ٹھیک ہوں، ٹھیک ہوں تم جاؤ بس ..... میں .....“

شکریہ تم جاؤ۔“

”اچھا پتر اللہ تجھ پر اپنا رحم کرے۔“ بوڑھا اسے دعائیں دیتا۔ ”نجانے کس ماں کا لال ہے، دماغ شاید چل بے چل ہو گیا ہے۔“ ریڑھی دھکیلتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جوان نے بمشکل خود کو استادہ کیا اور فٹ پاتھ پر قدم گھسیٹتا جاتا بڑبڑاتا جاتا۔ ”وہ اتھلیٹ“



## قص

روبی! ہاں..... پہلی مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو میں اس کی آنکھوں، نہیں شاید اداؤں، بے باکانہ چال، اس کے سنہری بالوں، خاص کروہ لٹ جو بار بار ہوا سے لہراتی اور اس کے رس بھرے ہونٹوں کو چومنے کی کوشش کرتی لیکن ہر بار وہ اسے بڑی بے دردی سے دور ہٹا دیتی اور پھر کبھی خود ہی اسے پکڑتی، اس کے کان مروڑتی، وہ چیخنے لگتی تو تھوڑا سا مسکراتی، چومتی اور پھر اسے دور ہٹا دیتی، لیکن نہیں، ان میں سے کسی نے بھی میرے اندر ہلچل پیدا نہ کی تھی جو آغاز محبت میں ہوتی ہے۔ پھر کیا چیز تھی جو مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہاں یاد آیا۔ ضرور یہ اس کے قہقہے تھے جو ہنستے تو اس کے جسم کا انگ انگ ان کا ساتھ دینے لگتا، میں ان قہقہوں کا اسیر ہو گیا تھا۔ بارگیا تھا روبی سے نہیں، روبی سے جو یونہی قہقہے لگاتی، شونخیاں کرتی میرے دل میں داخل ہو گئی تھی۔

عجیب لڑکی تھی دل میں بیٹھی نوشین کو دیکھ کر اس پر بہت ہنسی، قہقہے لگائے، اس کا تمسخر اڑایا لیکن نوشین بس خاموش ہی اسے گھورتی رہی، اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ دونوں کے درمیان جنگ میں روبی کے قہقہے نوشین کے ہر وار کو ڈھال کی طرح روک رہے تھے۔ روبی نے اپنی جیت دیکھی تو بڑھ کر اس نے نوشین کو بازو سے پکڑ کر دل کے اسی دروازے سے اسے نکال باہر کیا جس سے وہ خود اس میں داخل ہوئی تھی۔ نوشین کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میری آنکھوں میں روبی تصویر بنے کھڑی تھی، کہیں اس کا عکس تھا تو اشکوں میں جو میری شکست خوردہ آنکھوں سے باہر زندہ مر گئے تھے۔ لگا جیسے روبی سے پہلے کوئی اس گھر میں تھا ہی نہیں، شاید تھا بھی نہیں۔

میں نے ڈھونڈا گھر کی دیواروں پر سچی ساری تصویریں دیکھیں لیکن نوشین کہیں نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ بس ایک تھی۔۔۔۔۔۔ ایک روبی جو میرے سامنے بیٹھی ہے۔





کا اسیر ہو جاتا ہے، تڑپتا اور انتظار کرتا ہے اور پھر جب کسی دوسرے کو اس انتظار کی ڈور سے بندھے دیکھتا ہے تو اس کے منہ سے ایک ہی جملہ بے اختیار نکلتا ہے، ظالم سب ہی سے فلرٹ کرتی ہے، اس کے بعد وہ بھی اسے تماش بینوں کی کتے جیسی للچائی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔

ٹھیک ہے وہ فلرٹ کرتی ہوگی یا پھر کچھ اور بھی کرتی ہوگی لیکن مجھے تو اس کی آنکھوں میں کہیں فلرٹ نظر نہیں آیا تھا۔ ہوتا بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں نہ مانتا کہ مجھے اس کی ان آنکھوں میں جو چیز دکھائی دی تھی وہ سچائی تھی جسے دوسرے دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے۔ اس کی یہ سچی آنکھیں میں نے دیکھا تھا سچی رہنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔ کیوں؟ نہ شاید وہ خود جانتی ہے نہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے تو اس کے قہقہے دیکھے ہیں۔

وہ میرے سامنے بیٹھی ہے لیکن خیالوں میں گم کہیں اور ہے۔ شاید اس مقام پر جہاں شکست ہے۔ دکھ اور دکھ کا دکھ۔ خزاں کے سوکھے پتے کی طرح اس کے چہرے پر تیزی سے بے جان لکیریں بن رہی ہیں۔ تھکن سے چورہ بھاگ رہی ہے اور ماضی کا خیال ہے کہ خزاں کی تیز ہوا بنا کبھی اسے کہاں گھسیٹ لے جاتا ہے اور کبھی کہاں۔ وہ اس خیال کی اداس و ویران بے رحم دنیا سے نکلنا چاہتی ہے لیکن اس کی سچی آنکھیں اسے یہ منظر دکھائے چلی جاتی ہیں۔

وہ دیکھ رہی ہے کہ ماضی کی طرح حال اس کا ہے نہ ہی مستقبل، کیا کرے؟ میرے دل پسند قہقہوں کی جگہ سوال اس کے چہرے پر لکھے ہیں۔ امید کرے تو کس امید پر، اعتماد کرے تو کس پر۔ اور پھر کیا کوئی اس کا اعتماد کرے گا۔

میرے سامنے اس وقت روبی نہیں جس نے قہقہوں بھری اپنی شخصیت سے میرا دل جیتا تھا بلکہ گاؤں کی سیدھی سادی روبی بیٹھی ہے جو آج اپنے بارے میں اپنے وجود کے بار میں سوچ کر پریشان ہو گئی ہے۔ روبی جو محبت کے لفظ سے نا آشنا نہیں بلکہ حساس اور محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والی ہے۔ ہماری رفاقت کے لمحات میں روبی نے ہمیشہ پہلی روبی والا کردار ہی ادا کیا۔ ان لمحات میں زندگی اس طرح نہ تھی بلکہ قہقہوں اور خوشی سے رنگین اور بھرپور تھی۔ اگر اس کی یہ تبدیلی سچ ہے تو پھر گزرا کل کیا تھا، کیا وہ میرے لئے خوش ہونے کا کھیل کھیلتی رہی ہے۔ ٹھیک ہے لیکن آج خوشی کے موقع پر ہی اس میں یہ تبدیلی کیوں، میں سوچ رہا ہوں کہ شیریں اچانک سب کو مخاطب کر کے اعلان کرنے لگی



ہے کہ اب میری پیاری سہیلی روبی کے رقص کی باری ہے، رقص میں روبی کا ساتھ دیں گے وہ۔۔۔۔۔ ہیں، کہہ کہ شیریں خاموش ہو جاتی ہے اور سب کے چہروں پر موجود تجسس کو دیکھ کر بڑی مضحکہ خیزی سے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر ذرا توقف سے دوبارہ بتاتی ہے۔ وہ..... وہ..... وہ ہیں مسٹر شاہد۔

بہت سے نہ چاہتے ہوئے بھی اس انکشاف کا استقبال کرتے ہیں۔ خیالات کی اندھیری دنیا میں کھوئی روبی اچانک اس سرعام انکشاف پر شپٹا ہٹ کا اظہار کرتی ہے۔ نہ نہ نہیں نہیں میں رقص نہیں کروں گی، میں نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس دوران شیریں اور شاہ بھی میدان میں آچکے ہیں۔ رقص رقص موسیقی تالیاں تالیاں خوشیاں۔۔۔۔۔ گردن میں اپنی بانہوں کا ہار پہنائے دوسری روبی میرے ساتھ جھوم جھوم رہی ہے۔ میں اسے نہیں جانتا، جانتا بھی نہیں چاہتا، سنگدلی سے اسے پرے ہٹا دینا چاہتا ہوں، جان چھڑانا چاہتا ہوں اس سے، لیکن وہ ہے کہ گلے کا ہار بنی میرے ساتھ ساتھ چپکے جا رہی ہے، اس کی آنکھوں کی سچائی کچھ کہہ رہی ہے۔ اپنی مظلومی کی داستان سن رہی ہے لیکن میں یہ داستان نہیں سننا چاہتا تھا مجھے تو روبی سے غرض ہے جو میرے ساتھ قہقہے لگاتی اور زندگی کی رنگارنگی کو میرے ساتھ مل کر انجوائے کرتی تھی، اس سے زیادہ میں اس سے کوئی تعلق استوار نہیں کرنا چاہتا اور پھر میں نے کبھی اس کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

یقیناً آپ اسے میری خود غرضی کہیں گے۔ بے وفائی، سنگدلی یا ہر جائی پن۔ لیکن میں اس سے آگے نہیں جاسکتا کہ یہ میری واپسی ہو گئی اور میں واپس نو شین کے دیئے ہوئے تپتے صحرا میں نہیں اترنا چاہتا یہ بھی نہیں چاہتا کہ روبی بھی اس صحرا میں اترے۔

کیوں نہیں سمجھتی؟ جب میں روبی کو دل و جان سے اپنا ہی چکا ہوں تو پھر یہ دوسرا روپ کس لئے ہے، یہ روپ دکھا کر وہ مجھے کیا بتانا چاہتی ہے؟ رقص یہ کیسا ہے کہ ایک طرف شکست اور دوسری طرف لطف، میں تو لطف کے ساتھ ہم رقص ہونے کا عادی ہو چکا ہوں، اسی عادت میں جینا چاہتا ہوں، روبی کیا کہہ رہی ہے میں نہیں مان سکتا۔ مان بھی لوں تو کیا صرف ترس کھاتے ہوئے مجھے اسے اپنا نا ہوگا۔ ہاں، وہ انسان ہی تو ہے، لیکن نہیں، نہیں میں اسے اس طرح نہیں اپنا

سکتا۔ نفرت ہے مجھے نفرت ہے، نفرت ہے مجھے ایسے اداس، مایوس وقت کے ظالم ہاتھوں زخم رسیدہ لوگوں سے، میرے مزاج کو جانتی ہے پھر کیوں مجھے وہ یہ سوال کر کے مشکل میں ڈال رہی ہے، میں اس کے ساتھ ہم رقص یہ سوچ رہا ہوں کہ روبی اچانک مجھ سے پرے ہتی ہے اور سر سے پاؤں تک بھرپور نظر ڈالنے کے بعد ایک زوردار قہقہہ لگاتی ہے اور موسیقی کے ساتھ موسیقی ہونے لگتی ہے۔

شکست نے اس کی آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے لیکن وہ ان میں خود اذیت کی آگ جلانے نہیں رہی ہے، قہقہے لگا رہی ہے، ناچ رہی ہے، شیریں کے بھائی کی سالگرہ کے موقع پر میرے اور روبی کے تعلق کے انکشاف پر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ تعلق ہے تو ظاہر ہے تعلق کا پتہ بھی چلے گا۔ روبی نے بھی اس تعلق کا انکار نہیں کیا۔ مجھے بھی اگر کوئی اعتراض ہے تو دوسری روبی پر جو اچانک ہی میرے اور اس کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ کیا روبی نے میرے اندر کی اس رکاوٹ کو میرے چہرے پر پڑھ لیا ہے؟

شاید یہی وجہ ہے کہ وہ محفل سے لا تعلق رقصاں ہے اور میں اس کے جسم کے انگ انگ سے پھوٹنے والی خوشی کو دیکھ رہا ہوں جو وہ مجھے دیتی رہی ہے۔ ناچتے ناچتے وہ اس قدر کھو گئی کہ دیوانی ہو گئی۔ سب اسے حیرانی سے دیکھنے لگے ہیں۔ موسیقی بند ہو جاتی ہے لیکن وہ ناچ رہی ہے۔ محفل کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ سوال بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ چہ میگوئیاں۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے اسے۔۔۔۔۔ میرے ساتھ بیٹھے میرے دوست صداقت نے آہستگی سے پوچھا، شاید تم نے کچھ کہا ہے۔۔۔۔۔ نہیں، نہیں، تو نہیں۔۔۔۔۔ میں نے بوکھلاہٹ میں صداقت کو جواب دیا اور روبی کو دیوانہ وار ناچتے، چکر کاٹتے، دیکھتے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سب نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوسری روبی پر۔ مجھے لگا جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے اور سب نظروں کے تازیانوں سے مجھے مارنے لگے ہی۔ ناچتے، لڑکھڑاتے، ناچتے، آخر روبی چکرا کر گر گئی ہے۔ ایک بار پھر سب نے ایک نظر اس کی طرف اور دوسری نظر مجھ پر ڈالی ہے۔ میں آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہتا ہوں لیکن چاروں شانے چت پڑی روبی کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے مجھے میری جگہ پر جکڑ دیا ہے۔ نفرت ہے مجھے رونے والوں سے۔ کوئی اور





کہ میرا دماغ چکرانے لگا ہے۔ سیدھا آئینہ الٹا آئینہ ہر آئینے میں حیوان، سب حیوان مجھ پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ میرا تسخّر اڑا رہے ہیں اور مجھے اور تیزی سے بھاگنے کو کہہ رہے ہیں کہ کسی کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے، میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں لیکن آواز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ سسکیاں، قہقہے، سسکیاں، فرار، سسکیاں، قہقہے، فرار۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ایک طرف آئینہ اور دوسری طرف روبی ناچتی، قہقہے لگاتی، تالیاں بجاتی، میرا ٹھٹھہ اڑانے لگی ہے اور کبھی اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپانے، رونے اور سسکیاں بھرنے لگی ہے۔ سسکیاں جو میرے بڑھتے قدموں میں زنجیریں ڈالنے، انہیں جکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن نہیں اب کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔ قہقہے نہ سسکیاں۔۔۔۔۔ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ آزاد۔۔۔۔۔ ان دونوں انتہاؤں سے آزاد۔

سردرات۔۔۔۔۔ سرد تیز ہوا، بجلی کی تیز کڑک، تیز بارش، بارش میں بھگتی روشنیاں پھیلاتی تیز آہستہ بھاگتی گاڑیاں اور ان کے ہارنوں کا تیز شور۔۔۔۔۔ دروازے سے باہر میں نے زندگی سے بھرپور لمبا سانس لیا تو مجھے لگا جیسے طویل قید کے بعد رہائی پائی ہو۔ سیاہ طلسمی رات سے نکل کر روشنی کا دیدار کیا ہو، آزادی حاصل کی ہو، فٹ پاتھ پر تنہائی کے پراسرار احساس کے ساتھ تنہا کھڑا بارش میں بھیگ رہا ہوں۔ بھگتے، پانی میں شرابور ہوتے مجھے محسوس ہوا جیسے یہ بارش زندگی میں پہلی بارش ہے جو صدیوں سے میرے اندر بیٹھے میرے شکست کے احساس، غصے اور جلّتی آگ کو بجھانے لگی ہے۔ شعلے، بارش میں اس بارش میں، میں اپنے اور ربوبی کے درمیان کھڑا ہوں۔ فٹ پاتھ پر ٹھہرے پانی کو ٹھوکریں مارتے، بازوؤں کو بے ترتیبی سے ادھر ادھر ہلاتے ہوئے بے ترتیب ناچ ناچ رہا ہوں۔

روبی بھی یونہی ناچتی تھی۔ اور پھر یونہی ناچتے ناچتے لگا جیسے میں تنہا نہیں ناچ رہا بلکہ اس بے ترتیب ناچ میں روبی بھی میری ہم رقص ہے۔ رو بھی رہی ہے اور ہنس بھی۔ رونا اور ہنسا ہی تو زندگی ہے۔ ہاں ہاں میں نے یہ کیوں نہیں سمجھا، کیوں میں زندگی کو ایک ہی سمت سے دیکھ رہا ہوں۔ کس کے جرم کی سزا کس کو دے رہا ہوں۔ ہم رقص اے میری ہم رقص۔ بارش میں چاروں طرف روبی اور میں، روبی اور زندگی، میں اور زندگی ہم رقص ہیں۔

سرد ہوا کا زور ٹوٹ گیا ہے، بجلی کی کڑک ختم ہو گئی ہے۔ بارش تھم گئی ہے اور آسمان میں بادلوں سے پیچھے آنکھ مچولی



کھیلے چاند کی چاندنی اتر رہی ہے اور مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگی ہے۔ چاندنی میں میں ایک نظر اپنے آپ پر ڈالتا ہوں اور دوسری ایسے ہی پیچھے پلٹ جاتی ہے جہاں ریسٹورنٹ کے دروازے کے دھندلے شیشے کے پیچھے اکیلی روبی آنکھیں بند کئے شکست خوردہ حالت میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ چاندنی کے ساتھ بے اختیار میرے قدم میری ہم رقص کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔

